علّامہ اقبال کا خواب اور اُس کی قرآنی تعبیر

محمد احمد بلال

اس مضمون میں علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی فکر کے حوالے سے پاکستان کے مسائل کے حقیقی حل کی جانب توجہ مبذول کروائی جارہی ہے۔اس ضمن میں 'تاریخی نقطہ نظر' پر تفصیلی بحث ہے۔اقبال کے نزدیک فلسفۂ تاریخ کیا ہے؟ ہمارا historical perspective ناپید ہونے کے کیا نتائج ہوئے؟ قوموں کی زندگی میں تاریخ کے مطالعے کی کیا اہمیت ہے؟ نظریہ پاکستان کا ذکر خیر کرنے والے حضرات اور تنظیموں کو غور وفکر کی دعوت ہے کہ اقبال کے خواب کی تعبیر کہاں سے ملے گی؟ نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کے mechanics کو اگر صحیح سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مروّجہ مغربی جمہوریت کے راستے اقبال کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

تاریخ انسان کے مہذب معاشرتی دور کے ریکارڈ کو کہا جاتا ہے۔لیکن اگر تاریخ سے مراد وہ تمام عرصہ لیا جائے جو انسان نے کرۂ ارضی پر گزارا ہے' تو اس کا معاشرتی دور اس تمام کا دو فیصد ہی ہوگا(۱)۔ چنانچہ ایچ۔جی۔ویلز نے اپنی عالمی تاریخ کی کتاب Outline of the History کو بجا طور پر ابتدائے آفرینش سے شروع کیا ہے اور اس نے اپنے اس موقف کی تائید کے لیے فریڈرک راٹزیل کا قول نقل کیا ہے: ''نوعِ انسانی کی تاریخ کا فلسفہ جو واقعتاً اس نام کا مستحق ہو اس یقین سے پُر ہونا چاہیے کہ ہستی تمام کی تمام ایک ہی وحدت ہے۔وہ ایک ہی تصور ہے جو شروع سے آخر تک یکساں رہنے والے ایک ہی قانون پر قائم چلا آتا ہے۔''

لیکن کیا انسانی اعمال جن سے تاریخ کا تار و پود بنتا ہے کسی قاعدے یا قانون کے پابند ہیں؟ کیا ان کا کوئی مقصد ہے؟ کیا ان کی کوئی سمت یا منزلِ مقصود ہے؟ اگر ہے تو وہ کیا ہے؟ قومیں اور تہذیبیں کیوں اُبھرتی ہیں' کیوں مٹتی ہیں؟ کیا ان کے عروج و زوال کا کوئی اصول ہے؟ کیا کوئی قوم یا کوئی تہذیب ایسی بھی ہوسکتی ہے جو قوموں اور تہذیبوں کو مٹانے والے عوامل کی زد سے محفوظ رہ سکتی ہو؟ اور ارتقائے عالم کی منزلِ مقصود ہو؟ اس قوم کے اوصاف اور امتیازات کیا ہوں گے؟ کیا ہم ایسی قوم کو وجود میں لا سکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے آپ کو ایسی قوم بنا سکتے ہیں؟(۲)

قرآن حکیم میں 'غوطہ زنی' کے نتیجے میں انسان کا جو world view بنتا ہے وہ ایک خاص طرزِ عمل کو پیدا کرتا ہے۔اور اگر ہم دقت نظر سے جائزہ لیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے سائنسی علوم کا منبع قرآن حکیم ہے۔تاریخ ان میں سے ایک علم ہے۔اللہ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا﴾ لہٰذا

تاریخ اپنے عمل کو دہراتی ہے۔ایک مؤمن کے مطابق نہ تو تاریخ ازخود رواں ہے اور نہ اس کے مطالعہ اور ترجمانی کو الٰہی کارفرمائی سے علیحدہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔اللہ سبحانہ وتعالیٰ خالق کائنات ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخ کا بھی خالق ہے۔اس کا دست قدرت ایک ایک لمحے اور ہر تاریخی واقعے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔تاریخ وہ میدان ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی مرضی روبہ عمل آتی ہے اور اس کی کبریائی کا ظہور ہوتا ہے۔(۳)

آج کا انسان جس طرح اس کائنات پر غور وفکر کے نتیجے میں یہ جاننے میں کامیاب ہوا ہے کہ یہاں سائنسی قوانین کی عملداری کس طور سے ہوتی ہے' حالانکہ اس بنیادی نکتے کی جانب بہت کم توجہ ہوئی ہے کہ انسان کی سائنسی ترقی کے لیے orientation اس نے اسلام اور مسلم تہذیب سے حاصل کی ہے۔یہ بات ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنے مضمون ''اسلام اور سائنس'' میں بیان کی ہے۔اور حال ہی میں History of Science کے پروفیسر Dr. George Saliba نے بھی اس پر جامع تحقیق پیش کی ہے(۴)۔اسی طرح انسان اس نتیجے تک بھی پہنچ چکا ہے کہ تاریخ کی اپنی mechanics ہے۔چنانچہ آج دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں تاریخ کو ایک اہم مضمون کی حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اس ضرورت کا احساس اجاگر ہو چکا ہے کہ آج کے انسان کو آنے والے کل کی تاریخ لکھنے کے قابل ہونا چاہیے' یا کم از کم اپنی سوچ سے اس کا احاطہ کرنے کے۔چنانچہ تاریخ کو ایک سائنس کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔انسان نے یہ جان لیا ہے کہ مطالعہ تاریخ کی اصل افادیت اسی وقت ہے کہ اگر ہم آئندہ حالات کی پیشین گوئی کرسکیں۔اگر تاریخ ہمیں اس بات میں مدد نہیں دیتی کہ ہم آنے والے کل کا پتا چلاسکیں یا کم از کم آج کے انسان اور آنے والے دور کے انسان کے بارے میں جان سکیں تو پھر تاریخ ایک بیکار علم ہے۔کیونکہ سائنسی علوم کے لیے یہ لازمی ہے وہ ہمیں انسان کے بارے میں معلومات دے سکیں' مستقبل کے انسان کے حالات بتاسکیں اور آج اور آنے والے کل کے انسان کے نصب العین کا پتہ چلاسکیں۔لہٰذا ماضی کے انسان کے حالاتِ زندگی پر غور وفکر کرنا ہی وہ ابتدائی عمل ہے کہ جس سے بعدازاں ہم اپنے اور مستقبل کے بارے میں جانکاری حاصل کرسکتے ہیں۔(۵)

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے　　زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں بہت سے مؤرخین اور ماہرینِ عمرانیات نے مشہور مغربی انقلابات کا مطالعہ کیا' جن میں ۱۶۴۰ء کا English Revolution' ۱۷۷۶ء کا امریکی انقلاب' ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب' اور ۱۹۱۷ء کا روسی انقلاب قابل ذکر ہیں۔یہ مصنفین ان انقلابات کے process کے دوران پیش آنے والے مشترکات کی نشاندہی کرنا چاہتے تھے اور غیر معمولی طور پر ان میں سے ہر ایک میں اہم واقعات کے درمیان مطابقت تلاش کرنے میں کامیاب رہے۔اس تحقیق کی روشنی میں انقلاب کی ''قدرتی تاریخ'' کے بیشتر مشاہدات بعد ازاں اس قدر درست ثابت ہوئے کہ انہیں تجرباتی حقائق (empirical facts) اور عام قانونی اصولوں کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔(۶)

فلسفہ تاریخ کا عام تصور تو یہ ہے کہ تاریخ پڑھ کر اس سے اُن اصولوں کا استنباط کیا جائے جن سے تاریخ کی

حرکت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ چنانچہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ اگر کسی زمانے میں اور اکثر زمانوں میں انسانی تاریخ کے mechanics میں کوئی خرابی ہے' تو اصول سازی کے اس عمل کے نتیجے میں وہ خرابی اُصول میں بھی آجاتی ہے' کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ تاریخ نے اُس وقت حرکت اس طرح کی اور اُس سے فلسفۂ تاریخ کے ماہر نے یہ نتیجہ نکالا کہ تاریخ یوں ہی حرکت کیا کرتی ہے۔ (۷) اس میں غلطی کا امکان اس لیے موجود رہے گا' کیونکہ زمان ومکان کے فرق سے ممکن ہے تاریخ کے فلسفی کی نظر سے بعض ضروری واقعات تشنہ رہ گئے ہوں۔ یہ بھی عین ممکن ہے کے واقعے کے راوی نے اپنے خاص نقطہ نظر یا افتادِ طبع سے اسے پرکھا اور بیان کیا ہو۔کوئی واقعہ ایک exceptional صورت حال میں پیش آیا ہو تو اس کی generalization کرنا کیسا ہے؟ممکن ہے واقعہ بیان کرنے والا جھوٹا ہو یا پھر وہ آدھا سچ بیان کر رہا ہو اور کچھ پوشیدہ رکھ رہا ہو۔ وقت کے ساتھ زبان اور اصطلاحات میں تغیّر بھی ایک عنصر ہے۔

لیکن جب اُصول کا تعین ہم قرآن حکیم سے کریں اور اس کا انطباق تاریخ پر کریں تو تاریخ کی حرکت سند نہیں بلکہ خدا کا کلام سند ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور اُس ذات کے سامنے پورا تاریخی عمل نہ صرف یہ کہ آنِ واحد میں موجود ہے بلکہ وہ قادرِ مطلق ذات تاریخ کی خالق ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک قرآن سے ان اصولوں کا پتا چلتا ہے جن کی رو سے قوموں کی تقدیر کا فیصلہ ہوتا ہے اور جن کی بنا پر قوموں کی زندگی اور موت کی داستانیں مرتب ہوتی ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اقبال کے نزدیک قرآن کے اندر ایک ایسے فلسفہ تاریخ کے عناصر موجود ہیں جو قوموں کے عروج وزوال کے اسباب پر روشنی ڈالتا ہے۔اور اقبال کا یہ خیال درست ہے۔قرآن کا اپنا ایک فلسفۂ تاریخ ہے اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ درست ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم انسانی اعمال وافعال کی قوتِ محرکہ کا ایک ایسا نظریہ پیش کرتا ہے جو صحت اور معقولیت کے تمام معیاروں پر پورا اترتا ہے اور علمی دنیا پر قرآن حکیم کا یہ احسانِ عظیم ہے۔تاریخ کے فلسفی کا رول یہ ہے کہ وہ تاریخ کے حالات اور واقعات کا مطالعہ کر کے عمرانی تغیرات کے اصولوں کو دریافت کرے۔اس کی کاوشوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوموں اور تہذیبوں کا عروج وزوال کون سے قوانین کا پابند ہے اور ان کی بقا اور فنا میں کون سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔کیا کوئی تہذیب ایسی بھی ہوسکتی ہے جسے ہم حرکتِ تاریخ کی منزلِ مقصود قرار دے سکیں؟ جس پر زوال اور فنا کے عوامل اثر انداز نہ ہوں؟ اور جس کے لیے عروج اور بقا کے عوامل پوری شدت اور قوت سے اپنا کام کریں۔اگر کوئی تہذیب ایسی بھی ہوسکتی ہے تو اس کے لوازمات کیا ہیں؟ اور فلسفۂ تاریخ کا عملی فائدہ یہ ہے کہ اس کی روشنی میں قومیں زوال اور فنا کی راہوں سے بچ کو عروج وبقا کے راستوں پر گامزن ہوسکتی ہیں۔لیکن فلسفۂ تاریخ کا عملی فائدہ اسی صورت میں ایک حقیقت بن سکتا ہے جب فلسفۂ تاریخ صحیح ہو اور اس کے مطالعے سے درحقیقت قوموں کے عروج وزوال اور فنا وبقا کے صحیح قوانین کا پتا چلتا ہو اور قائم رہنے والی تہذیب کے لوازمات کا علم حاصل ہوتا ہو۔ (۸)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے مطابق فلسفۂ تاریخ کوئی الگ تھلگ فلسفہ نہیں ہوسکتا بلکہ ہمیں انسان کے اعمال

کی قوتِ محرکہ کے فلسفہ کو ہی فلسفۂ تاریخ کہنا پڑتا ہے۔ لہٰذا تاریخ کے فلسفی کے لیے یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ انسان کی کون سی خواہش ہے جو اس کے اعمال کی قوتِ محرکہ ہے۔ اگر وہ اس خواہش کو جان اور پہچان لے تو پھر انسانی اعمال و اَفعال اور تاریخ کے سارے واقعات اور حالات کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لیے ایک کلید ان کے ہاتھ آجاتی ہے اور وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ تاریخ کے واقعات میں‘ جس حد تک کہ وہ انسانی اعمال سے متشکّل ہوتے ہیں‘ کون سا اُصول کارفرما ہے۔ اب تک اس کی کارفرمائی کس طریق سے ہوتی رہی ہے اور آخر کار کیا نتائج پیدا کرے گی؟ چونکہ اسے معلوم ہوگا کہ تاریخ کے سارے عمل کا باعث انسان کی اس حکمران خواہش کی مکمل اور مستقل تشفی اور تسکین ہے‘ وہ عمل تاریخ کی غرض و غایت کو سمجھ سکے گا اور نوعِ انسانی کے مستقبل سے متعلق واضح نظریات بہم پہنچا سکے گا اور کسی قوم کے زوال کو عروج میں بدلنے کے لیے واضح تجاویز پیش کر سکے گا۔ اس کے تمام نتائج صحیح ہوں گے اور اس کا استدلال اندرونی تضادات سے پاک ہوگا۔

اس کے برعکس اگر تاریخ کا کوئی فلسفی یہ نہ جانتا ہو کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ کون سی ہے تو چونکہ وہ انسانی نفسیات کے قوانین سے نابلد ہوگا‘ وہ تاریخ کے واقعات کو جو قوانین نفسیات کے قدرتی مظاہر ہیں‘ ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکے گا اور ان کو معنی خیز بنانے کے لیے اور ان کی تشریح کرنے کے لیے وہ بے بنیاد اور وہمی قوانین و اصول وضع کرے گا۔ ایک وقت وہ تھا جب انسان مادی قوانین سے نابلد تھا اور مادی دنیا کے قدرتی مظاہر مثلاً سورج یا چاند کا گرہن‘ چاند کا بڑھنا گھٹنا‘ بھونچال‘ آندھیاں‘ بجلی اور کڑکے‘ موسموں کا تغیّر وغیرہ کی تشریح کے لیے دیوتاؤں کے عمل دخل ایسے وہمی اسباب تلاش کیا کرتا تھا۔ لیکن مادی قوانین کے علم کے پھیل جانے کے بعد یہ توہمات خود بخود ختم ہو گئے۔ نفسیاتِ انسانی کے قوانین کی لاعلمی کی حالت میں انسانی دنیا کو سمجھنے کے لیے تاریخ کے ایک فلسفی کی ذہنی کوشش ایسی ہی پسماندہ اور مضحکہ خیز تھی جنہوں نے مادی قوانین کی لاعلمی کی حالت میں مادی دنیا کے مظاہر کو دیوتاؤں کے عمل دخل کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اگر ہم تاریخ کے ایسے فلسفی کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہوئے اس حد تک جانا نہ چاہیں تو پھر بھی یہ بات ظاہر ہے کہ تاریخ کو ایسا فلسفی چونکہ تاریخی واقعات کے صرف ایک پہلو یعنی خارجی پہلو کو ہی دیکھتا ہے لہٰذا وہ ان سے صحیح نتائج اخذ نہیں کر سکتا۔ (۹)

اس حوالے سے ایک مغربی فلسفی کا قول بھی بیان کرنے سے تعلق رکھتا ہے:

"We may detect immediately a common assumption basic to all revolutions: the centrality of time and history and their real grip on the human being. Without this assumption, talk about revolution is idle." (۱۰)

کارل مارکس کہتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اقتصادی ضروریات کی خواہش ہے۔ فرائیڈ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اس کی وہ خواہش ہے جسے جنسیت کہا جاتا ہے۔ ایڈلر کے مطابق یہ قوت غلبہ اور تفوق کی خواہش ہے۔ میکڈوگل کے مطابق انسان کے اعمال کو حرکت میں لانے والی خواہش ایک نہیں بلکہ تمام جبلتی خواہشیں ہیں۔ گویا ان تمام حکماء اور فطرتِ انسانی کے رموز و اسرار کا مطالعہ کرنے والے علماء کا خیال یہ ہے کہ انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اس کی حیوانی جبلتوں میں سے کوئی ایک جبلت ہے یا تمام جبلتیں ہیں۔

انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ کے متعلق قرآن کا نظریہ ان تمام نظریات سے مختلف ہے۔ قرآن کے نزدیک انسان کے اعمال کی قوتِ محرکہ اس کی کوئی ایک جبلت یا بہت سی جبلتیں نہیں بلکہ خود تصورِ حسن و کمال یا نصب العین کی خواہش ہے (یعنی انسان کی شخصیت کا سب سے potent feature جو اس کے تمام افعال کا محرک ہے، وہ کسی آدرش کی محبت ہے) اور جو دورِ حاضر کے تمام حکماء کے نزدیک بھی انسان کو حیوان پر امتیاز بخشتی ہے، اور قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ نصب العین جو اس خواہش کو مستقل اور مکمل طور پر مطمئن کرتا ہے خدا کا نصب العین ہے۔ (۱۱)

اس خواہش کی تشفّی کا ہی دوسرا نام دین کی پیروی ہے، اور یہی عبادت ہے، جسے قرآن انسان کی پوری فطرت قرار دیتا ہے جس پر انسان کو پیدا کیا گیا اور جو کسی حالت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ﴾ (الروم: ۳۰)

''(اے نبی ﷺ!) پس اللہ کے دین پر یکسوئی سے قائم رہو۔ یہ وہی فطرت ہے جس پر اللہ نے انسان کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کے پیدا کردہ پیدائشی تقاضے بدلا نہیں کرتے، لہٰذا یہ دین پکی بنیاد پر ہے۔''

ایک اور اہم بات لائق توجہ ہے کہ چونکہ تاریخ کو بطورِ علم اس بات پر انحصار ہے کہ اس کا تمام مواد سانحوں اور واقعات سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا واقعات کی صحت کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کا بیان کرنے والا کون ہے۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْۤا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶﴾ (الحجرات)

''اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو اور پھر اپنے کیے پر پشیمان ہو۔''

قرآن نے ہمیں تاریخ پر تنقید کا بنیادی اصول دیا ہے۔ چونکہ تاریخ کی بطور سائنسی قطعیت کی شرط یہ ہے کہ بیان شدہ حقائق جن سے تاریخ کا مواد مرتب ہوتا ہے وہ مکمل طور پر درست ہوں اور حقائق کے درست علم کا دارومدار بالآخر ان پر ہے جو ان کو بیان کرتے ہیں۔ تاریخ پر تنقید کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ان حقائق کو بیان کرنے والوں کی شہادت کے سلسلے میں ان کا ذاتی کردار اہم گردانا جائے۔ (۱۲) قرآن مجید اس بات سے صرفِ نظر نہیں کرتا کہ ایک بات کون کر رہا ہے، یعنی صرف اتنا سمجھنا کافی نہیں ہے کہ بات کیا ہو رہی ہے، بلکہ کلام کے حقیقی معنی متکلّم کی معرفت سے پیدا ہوتے ہیں، نہ کہ اس کے الفاظ سے۔

قرآن اپنے مفکّر کو ایسے ذرائع بہم پہنچاتا ہے جن کو بروئے کار لا کر موجودہ اور مستقبل کے challenges کا سامنا کیا جا سکے، ان کے اسباب و علل جان کر حقیقی حل بتایا جا سکے۔ مثال کے طور پر اقبال ایک جگہ لکھتے ہیں:

''تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ حائلی مملکتیں (Buffer States) عظیم سیاسی وحدتوں کی صورت اختیار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ ملک شام، جو کہ سلطنتِ روما اور اہلِ فارس کے درمیان ایک حائلی مملکت تھی، اس صورت حال سے دوچار رہا۔ لہٰذا افغانستان کے مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرنا دشوار ہے۔'' (۱۳)

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اقبال کا تاریخی نقطہ نظر قرآن ہی کی بدولت بنا۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں:

''میں گزشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں۔ ہر روز تلاوت کرتا ہوں' مگر میں ابھی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات کی قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس مطمحِ حیات سے کس طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یونیورسٹی ایسے لوگوں کی ایک تعداد پیدا کردے گی جو مطالعہ قرآن میں اپنی زندگیاں صرف کردیں گے''۔ (۱۴)

اسلام اپنے ماننے والوں پر زور دیتا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے محض ظاہری خدوخال کو نہ دیکھیں' بلکہ ان واقعات کے اندرونی محرکاتِ عمل (undercurrents) کی جانب توجہ مبذول کرواتا ہے جن کی وجہ سے وہ رونما ہوئے ہیں۔ تاریخی حوالہ جات اور ماضی کے واقعات جو کہ قرآن میں دیے گئے ہیں' اس قدر تفصیلی تو نہیں کہ حقائق کے متلاشی ذہن میں موجود تمام تر خلا کو پُر کردیں' البتہ ان واقعات کی مدد سے ہم اپنی معلومات کو منظّم کرسکتے ہیں' ان کی عمومی تشکیل (generalization) کرسکتے ہیں اور ان میں سبق آموزی بھی ہے۔ یہ غیر معمولی واقعات کا انتخاب کرکے ان کی اخلاقی قوانین کی روشنی میں ترجمانی کرتا ہے اور اخلاقی فیصلوں کے مطابق ان کے مستقبل کا تخمینہ لگاتا ہے۔ اور اس تمام عمل میں بنی نوع انسان کی تقدیر کے بارے میں اہم سوالات کے جواب فراہم کرتا ہے۔ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے تاریخی حقائق کی جانب اسلام کا یہ رویہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ (۱۵) قوموں کا عروج وزوال قدرت کے قانونِ اٹل سے منسلک ہوتا ہے۔ تاریخ ہمیں اس کے بارے میں معلومات فراہم کرتی ہے کہ فلاں قوم نے جب حکم خداوندی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا نتیجہ اچھا ہوا۔ جب اس نے روگردانی کی تو اس کا انجام کیا ہوا۔ قرآن 'ایام اللہ' کو اس مقصد سے بیان کرتا ہے کہ ہم دنیا میں اپنا مقام سمجھ سکیں اور زمانے کے حالات کی درست ترجمانی کرسکیں۔ اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ''اللہ کے دنوں'' اور ''اُس کی آیات'' کو یوں اپنے اندر اتنا گہرا اُتار لیں کہ وہ ہماری آنکھوں کا کام دینے لگیں۔ واقعات کے بین السطور جھانکنے اور تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کریں۔

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰی بِاٰیٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَیّٰمِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ۝﴾ (ابراھیم)

''ہم اس سے پہلے موسیٰؑ کو بھی اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیج چکے ہیں (اسے بھی ہم نے حکم دیا تھا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاؤ اور انہیں ایام اللہ کے ذریعے سے نصیحت کرو۔ بیشک ان میں بڑی نشانیاں ہیں ہر اُس شخص کے لیے جو خوب صبر اور شکر کرنے والا ہو۔''

اللہ کے دنوں سے مراد تاریخ کے وہ سنگ ہائے میل ہیں جو اس کی حرکت پذیری کے حقیقی اسباب (cause and effect relation) کو اپنے مفکّر پر واضح کرتے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح باری تعالیٰ نے کئی مرتبہ تاریخ کی سمت کو درست (Divine Intervention) کرکے صراطِ مستقیم کی جانب موڑا ہے۔ قرآنی فکر انسان کے قلب وذہن میں یوں جذب ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف پیش آمدہ اہم واقعات کو سمجھ

لے بلکہ اس تاریخ کے تحرک میں حق کی کارفرمائی بھی اس پر واضح ہو جائے۔ (۱۶)

بعض مؤرخین تاریخ کو ایک ایسے انداز میں بیان کرنے پر مصر ہیں کہ جیسے یہ محض ماضی کے گم گشتہ واقعات ہوں، یعنی پچھلے لوگوں کو قصے اور محض عجائب گھر میں سجانے کے قابل اشیاء کا تعارف۔ تاریخ کے بارے میں یہ نقطہ نظر ہی معاشروں کے اپنے تاریخی نقطہ نظر (Historical Perspective) کو ناپید کر ڈالنے کا نتیجہ بنا ہے (۱۷)۔ لوگوں کو ان کے ماضی سے الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ اپنے حال ہی میں مست رہنے کے لیے ہیں اور انہیں اپنی تقدیر کے فیصلوں میں تاریخ کے کردار کی کوئی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ ''تاریخی نقطہ نظر'' سے مراد کسی موضوع کو اس کے ابتدائی مراحل اور بعد ازاں اس کے ارتقائی منازل کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔

ہمارے یہاں مذہبی مدارس میں تو تاریخ بطورِ نصاب سرے سے پڑھائی ہی نہیں جا رہی اور سیکولر تعلیمی اداروں میں بھی اس کی تدریس ناقص ہے، حالانکہ تاریخ کی اہمیت قوموں کے لیے ایسی ہے جیسا کہ ایک شخص کے لیے اس کی یادداشت اہم ہے۔ اگر ایک شخص کی یادداشت کھو جائے تو اسے کچھ بجھائی نہیں دے گا کہ وہ کہاں سے آیا ہے، اُس کا کس سے تعلق ہے اور اس کا کون سا راستہ تھا جو وہ بھول گیا ہے۔ نظام تعلیم کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہم ایسے سماجی عمل میں اپنا کردار سمجھیں جس کے ذریعے آنے والی نسلیں اپنی قومی تاریخ کے ساتھ ایک نظریاتی وابستگی قائم کر سکیں، اور انہیں سوچنے اور عمل کرنے کے اس خاص انداز سے بہرہ ور کیا جائے جو کہ قومی تاریخ اور ثقافت کے اصولوں اور قوانین سے مطابقت رکھتے ہوں۔ (۱۸) ایک ایسے تعلیمی نظام کے نہ ہونے کی وجہ سے اس ملک کا اسلامی نظریہ، جس کو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام الناس کے اجتماعی شعور میں جاگزیں ہونا چاہیے تھا، خود ہی ایک متنازعہ مسئلہ بن چکا ہے۔ ہمارے یہاں کا ایک معتدل پڑھا لکھا انسان بھی مسائل کے عارضی، سطحی، فوری، مروّجہ آسان اور سستے حل کی جانب جھکاؤ رکھتا ہے۔ ہمارے معروف دانشوروں کے تبصروں میں عجلت پسندی جھلکتی ہے اور اکثر اوقات تضاد نظر آتا ہے کہ ان کا perspective تنگ ہے۔ اس کی بنیادی وجہ جو سمجھ آتی ہے وہ یہی کہ ہر واقعے اور مسئلے کو اس کی ظاہری بناوٹ کے مطابق نیا سمجھ کر اور تاریخ سے disconnect کر کے treat کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا کہ تاریخ سے میری مراد محض ماضی قریب نہیں بلکہ تمام کی تمام تاریخ ہے۔ عام طور پر یہ حضرات ماضی کو اساطیر الاوّلین قرار دے کر بحث سے باہر کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی مثال دی بھی جائے تو ماضی قریب یا زمانۂ حال ہی کے کسی دوسرے ملک کی جس میں خاطر خواہ ابہام ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک تاریخ سے رشتہ قائم کرنا عقل مندی ہی نہیں ہے۔ غالباً historical consciousness کی عدم موجودگی کی وجہ established paradigm میں اس کی گنجائش نہ ہونا ہے۔ جیسا کہ مشہور امریکی ماہر عمرانیات George Ritzer کہتا ہے:

All intellectual fields are profoundly shaped by their social settings.

اور ایک برطانوی مصنفہ لکھتی ہیں:

In capitalist society, we are taught history at school from the standpoint and interests of the ruling class; ie . the capitalist

class.The university historians who write school text books pretend to be objective and factual, when in most cases they are interpreting historical events and struggles from the standpoint of capitalism. A revolutionary party therefore has to carry out a different type of education entirely. (۱۹)

بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر　　کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

Thomas Kuhn جو کہ Philosopher of Science ہے' وہ یہ کہتا ہے کہ Science has a social dimension۔ لہٰذا سائنسی تحقیق اور ترقی (Research & Development) کے بھی وہ میدان ترجیحاً اختیار کیے جاتے ہیں جو سرمایہ دارانہ جمہوریت سے مطابقت رکھتے ہوں۔ جیسا کہ پاکستان میں تحقیق کے اندر ٹیکنالوجی کی دریافت اور اسی میں ترقی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مگر Social Sciences کا حال یہ ہے کہ عالمی اداروں کے سودی قرض کے ساتھ معاشی و معاشرتی ماہرین بھی درآمد کئے جاتے ہیں۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا　　اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا　　آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا (۲۰)

اور

فرد چوں پیوندِ ایامش گسیخت　　شانۂ ادراکِ او دندانہ ریخت

''جب فرد کا تعلق اُس کے ماضی سے نہ رہے تو اس کی فہم و فراست کی کنگھی کے دندانے گر جاتے ہیں۔''

قوم روشن از سوادِ سرگزشت　　خود شناس آمد ز یادِ سرگزشت

''قوم اپنی تاریخ سے روشنی حاصل کرتی ہے اور اپنی روایات کی یاد سے اس کے اندر خودشناسی پیدا ہوتی ہے۔''

سرگزشتِ او گر از یادش رود　　باز اندر نیستی گم می شود

''اگر تاریخ کی سرگزشت اس کی یاد سے محو ہو جائے تو وہ پھر نیستی میں گم ہو جاتی ہے۔''

نسخہ بودِ ترا اے ہوشمند　　ربطِ ایام آمدہ شیرازہ بند

''اے عقلمند! تیری زندگی کا نسخہ یہ ہے کہ تو اپنے گزشتہ واقعات کی شیرازہ بندی کرے۔'' (۲۱)

محراب و منبر سے مسلمانوں کے ماضی کے قصے تو سنائے جاتے ہیں' اَسلاف کا ذکر خیر بھی ہوتا ہے' لیکن بالکل سرسری انداز میں اور سبق آموزی کو بالائے طاق رکھ کر۔ جس سے حاضرین میں کچھ تعصب تو پیدا ہو جاتا ہے لیکن کوئی line of action سمجھ میں نہیں آتی۔

تھے تو آبا وہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو؟　　ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو !

ایک گروہ ہمارے یہاں تاریخی واقعات کی سطحی تشریحات کرنے میں اتنا جری اور غیر محتاط ہے کہ خیر القرون کی عظیم ہستیوں کو نشانہ بناتا ہوا نہیں تھکتا۔ ان کے بارے میں زبان درازی اور بعض اوقات شب و ستم سے بھی گریز نہیں کرتا۔ تاریخ کا ان کے یہاں superficial اور بالکل subjective نقطۂ نظر

ہے۔اکثر اوقات محض بیان کردہ لفاظی سے ہی واقعے کی پوری منظر کشی کر دیتے ہیں۔ان کے سامعین بھی رقت جذبات سے لبریز ہوتے ہیں لہٰذا زیادہ تفصیلی دلائل کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی۔تاریخ کی یہ تعبیر بعض اوقات قرآنی حقائق کی نفی کر رہی ہوتی ہے' لہٰذا اب قرآن کی باطنی تعبیریں کرنا پڑتی ہیں۔

ولے تاویلِ شاں در حیرت انداخت　　خدا و جبرئیل و مصطفیٰؐ را

بعض مخلص مگر نادان حضرات تاریخ کے عمل سے نابلد ہونے کی وجہ سے پورے course of life کو پیچھے لوٹانے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔یہ escapist tendency ہے۔جیسا کہ فرانسیسی انقلاب کے بعد جو social disorder آیا اس سے بیزار ہو کر بعض اوسط درجے کے مفکرین اس تمام سماجی عمل کو واپس قرونِ وسطیٰ کے ''پُرامن'' دور کی جانب لوٹانے کے خواہش مند تھے۔لیکن زیادہ باریک بینی سے جائزہ لینے والے مفکّرین نے خرابیوں کی نشاندہی کے باوجود اس بات پر زور دیا کہ اتنی ہمہ گیر سماجی تبدیلی آجانے کے بعد واپسی ممکن نہیں۔چنانچہ انہوں نے سماج کی تشکیل کی خاطر نئی بنیادیں تلاش کرنے کی کاوش کی۔یہی اپروچ اقبال کے یہاں بھی ملتی ہے کہ مغربی اقوام کی اندھا دھند تقلید' مادیت پرستی اور الحاد کا مقابلہ محض conservative criticism سے نہیں کیا جا سکتا بلکہ فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کرنا ہوگی۔

اقبال نئی نسل کو نصیحت کرتے ہیں:

''ایک بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشافِ ماضی ہے۔میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔میں تو مستقبل کا معتقد ہوں۔مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں۔اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمہ تہذیب و شائستگی کو سمجھا جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں۔چونکہ ہم جدید تہذیب و شائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے۔یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے۔اس طریقہ استقرائی کے نتائج و ثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔(۲۲)

چیست تاریخ اے زخود بیگانۂ　　داستانے قصۂ افسانۂ؟

''اے اپنے آپ سے بے خبر! تاریخ کوئی داستان' قصہ یا افسانہ نہیں۔''

ایں ترا از خویشتن آگہ کند　　آشنائے کار و مردِ رہ کند

''بلکہ یہ وہ چیز ہے جو تجھے اپنے آپ سے آگاہ کرتی ہے اور تجھے مردِ کار اور مردِ راہ بناتی ہے۔''

روح را سرمایۂ تاب است ایں　　جسمِ ملّت را چو اَعصاب است ایں

''تاریخ روح ملت کی قوت کا سرمایہ اور اس کے بدن کے لیے بمنزلہ اعصاب ہے۔''

ہمچو خنجر برفسانت می زند　　باز بر روئے جہانت می زند

''وہ تجھے خنجر پرسان کی طرح تیز کرتی ہے اور پھر دنیا کے مقابلے میں آزماتی ہے۔''

وہ چہ سازِ جاں نگار و دل پذیر نغمہ ہائے رفتہ در تارش اسیر

''واہ تاریخ کیسا جان افروز اور دل پذیر ساز ہے، جس کے تار میں گزشتہ نغمے اسیر ہو جاتے ہیں۔''

شعلۂ افسردہ در سوزش نگر دوش در آغوشِ امروزش نگر

''اس کے سوز میں ماضی کے بجھے ہوئے شعلے دیکھ اور اس کے آج میں گزشتہ کل کا نظارہ کر۔''

شمع او بختِ امم را کوکب است روشن از وے امشب و ہم دیشب است

''اس کی شمع قوموں کے نصیب کا ستارہ ہے، جس سے آج اور کل کی راتیں روشن ہوتی ہیں۔''

چشمِ پُر کارے کہ بیند رفتہ را پیشِ تو باز آفریند رفتہ را

''وہ ہوشیار آنکھ جو ماضی کو دیکھتی ہے وہ تیرے سامنے اسے دوبارہ زندہ کر دیتی ہے۔''

بادۂ صد سالہ در مینائے او مستیٔ پارینہ در صہبائے او

''تاریخ کی صراحی میں ایسی پرانی صد سالہ شراب موجود ہے جس کے اندر ماضی کی مستی محفوظ ہے۔''

صید گیرے کو بدام اندر کشید طائرے کز بوستانِ ما پرید

''تاریخ وہ شکاری ہے جو اس پرندے کو اپنے دام میں لے آتی ہے جو ہمارے باغ سے اُڑ چکا ہے۔''

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

''تاریخ کو محفوظ کر کے پائندہ اور گزرے ہوئے سانسوں سے زندہ ہو جا۔''

دوش را پیوند با امروز کن زندگی را مرغِ دست آموز کن

''ماضی کا تعلق حال سے جوڑ لے اور زندگی کو اپنا پالتو پرندہ بنا لے۔''

رشتۂ ایّام را آور بدست ورنہ گردی روز کور و شب پرست

''ایام کے رشتے کو اپنے ہاتھ میں مضبوط پکڑ ورنہ تو دن کا اندھا اور رات کا پجاری بن کے رہ جائے گا۔''

سرزند از ماضیٔ تو حالِ تو خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

''تیرا حال تیرے ماضی سے پیدا ہوتا ہے اور تیرا مستقبل تیرے حال سے۔''

مشکن ار خواہی حیاتِ لازوال رشتۂ ماضی زاستقبال و حال

''اگر تو حیاتِ لازوال چاہتا ہے تو ماضی کا رشتہ حال و مستقبل سے قطع نہ کر۔''

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی است مے کشاں را شورِ قلقل زندگی است

''زندگی تسلسلِ واقعات کے فہم کی موج ہے، جیسے مے کشوں کے لیے شورِ قلقل زندگی ہے۔''(۲۳)

ابن خلدون سے لے کر ٹائن بی تک نے قوموں کے زوال کی توجیہہ کی ہے۔ تمام فلسفی تاریخ زوال کی توجیہہ کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے بتایا کہ جب عصبیت زائل ہو جائے تو قوم میں زوال آ جاتا ہے، لیکن عصبیت دوبارہ پیدا کرنے کی کیا شکل ہوگی؟ ٹائن بی نے بتایا کہ اگر معاشرے میں response پیدا ہونا ختم ہو جائے تو زوال پیدا ہو جاتا ہے، تو اُن سے پوچھا جائے کہ response کیسے پیدا ہوتا ہے؟ مقصد کسی کے زوال کی توجیہہ

کر لینا ہی نہیں ہے۔ کارل مارکس کہتا ہے:

The philosophers have only interpreted the world in various ways—the point however is to change it. (۲۴)

دنیا میں صرف ایک کتاب ایسی ہے جو زوال کی ٹھیک توجیہہ ہی نہیں کرتی' زوال سے نکلنے کا درست راستہ بھی بتاتی ہے اور وہ کتاب ہے قرآن کریم' اور اُسی کے سائے میں ہم آج بھی زوال سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔

چوں سرمۂ رازی راازدیدہ فروشستم تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بکتاب اندر! (اقبال)

مصور پاکستان حضرت علامہ محمد اقبال کا خواب جس کی تعبیر ڈھونڈتے ہمیں تقریباً پون صدی بیت چکی:

''میں ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک متحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اس سے ایک جانب تو ہندوستان کے اندر طاقت کے توازن کی بدولت امن وامان قائم ہو جائے گا' اور اسلام کے لیے ایک موقع فراہم ہو جائے گا کہ وہ اُن اثرات سے آزاد ہو جائے جو عرب شہنشاہیت کے دور میں اس پر پڑ گئے تھے' اور اپنے قوانین' اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لا کر اسلام کی اصل روح کا عصر جدید سے رابطہ قائم کر سکے''۔ (۲۵)

اور آج جس درجے کنفیوژن ہے اس حوالے سے کہ پاکستان قائم کیوں ہوا تھا اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہ سب سے بڑا کنفیوژن اس امر سے پیدا ہوا کہ پاکستان کی تخلیق تو ہوئی تاریخ کی ان قوتوں کے ذریعے جو اوپر سے متعین ہوتی ہیں' اور اس کی تعبیر کی گئی ان قوتوں کے ذریعے جو ادنیٰ درجے سے پیدا ہوئیں۔ حضرت سلیمان اور حضرت داؤد علیہما السلام کے زمانے کا قصہ ہے کہ دو عورتیں ایک بچے کو لے کر پہنچیں۔ ایک کہنے لگی یہ بچہ میرا ہے اور دوسری نے کہا کہ اس کا ہے۔ اسی طرح محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ کے ایوان میں آج دین اور ریاست اپنے بچے کو یعنی فرد کو لے کر پہنچی ہوئی ہیں۔ اصل ماں اس کی دین ہے جس کا جی نہیں چاہتا کہ اسے دو ٹکڑے کر دیا جائے' جبکہ ریاست اس بات پر مصر ہے کہ یہ بچہ اُس کا ہے اور اگر آدھا بھی مل جائے تو کافی ہے۔ اس کے پیچھے درحقیقت اُلجھن یہ ہے جو سمجھ میں نہیں آتی کہ اصل کنفیوژن ذہنوں میں تصورِ انسان کے بارے میں ہے۔ اگر آپ کا تصور انسان یہ ہے کہ انسان ایک سماجی حیوان ہے تو آپ اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتے کہ مغربی طرز جمہوریت کے علاوہ پاکستان کو چلایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کا تصور یہ ہے کہ انسان ایک معاشی حیوان ہے تو اشیاء اور خیالات کی منطق آپ کو اس کے علاوہ کسی نتیجے پر پہنچنے نہیں دے گی کہ پاکستان کا مستقبل مارکسزم ہے۔ لیکن اگر آپ کا تصور یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض ہے تو آپ کے ذہن کی منطق اور آپ کا پورا استدلال آپ کو مجبور کر کے یہاں لے جائے گا کہ اس مملکت کا مقصود اور اس کی بنیاد' اس کا روٹ اور اس کا کراؤن دونوں غیر مذہبی کسی طرح نہیں ہو سکتے' اس لیے کہ دین آدھے پونے چوتھائی آدمی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ: Absoluteness of Truth demands totality of Faith.(۲۶) اس قسم کے نظریاتی اور فلسفیانہ اختلافات کا کیا ممکنہ حل ہے؟

"Many philosophical contradictions cannot be fully resolved

through intellectual debates, but they call for addressing the concrete social, political, and economic conditions, that have given rise to---or are reflected in---such contradictions. Yet changing the world in a concrete sense is hardly possible without re-interpreting it in fresh ways, and therefore the difference between "interpreting the world" and "changing the world" can be seen as only a matter of emphasis." (۲۷)

۶۵ سال کے بعد یہ جائزہ لینا ضروری ہے ہم نے اپنی منزل کی جانب کتنا فاصلہ طے کیا؟ وقت گزرنے کے ساتھ یہاں کے عوام وخواص کی اس ملک سے وابستگی بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے؟ وہ کس حد تک اس ملک کے لیے قربانیاں دینے کو تیار ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصورِ تاریخ جو خارج میں نتائج پیدا نہیں کر سکتا عین ممکن ہے کہ پختہ ایمان کے لوگوں میں ان کے ایمان بالغیب کو disturb نہ کرے' لیکن یہ تو ممکن ہے کہ ان کا یقین مضمحل کر دے' کیونکہ یقین کا مدار اور یقین کی بنیاد تجرباتی مشاہدات پر ہے۔ جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس قصہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جس میں آپؑ نے اللہ تعالیٰ سے دریافت کیا کہ وہ مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اس ملک کے عوام اسلام سے دلچسپی نہیں رکھتے تو یہ احسان فراموشی ہوگی۔ لہٰذا جو اجتماعی کیفیت قلب ہے وہ کافی گہری ہے' لیکن اس کے مظاہر خارجی کی تخلیق کرنے والی جو قوتیں رہیں انہوں نے وہ راستے اختیار کیے جو اسلام کی آفاقیت سے مطابقت نہیں رکھتے تھے' بلکہ وقتی' عارضی' سطحی' اور محدود نتائج پیدا کرنے والے تھے۔ لیکن دوسری جانب دنیا کے کسی کونے میں ایک آدمی بھی اسلام کا اصل موقف اختیار کرے گا تو اس کا مقابلہ اور معارضہ صرف وہاں کی قوتیں نہیں کریں گی' بلکہ چونکہ اسلام کے ہر اُصول میں ایک آفاقیت کارفرما ہے' لہٰذا ابدی کی آفاقی قوتیں اس کے مقابل صف آرا ہو جائیں گی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ ایک مؤقف اختیار کریں اور وہ آپ کے محلے تک محدود رہ جائے تو وہ اسلامی نہیں ہوگا۔ (۲۸)

دراصل جس تصورِ تاریخ کی بنیاد پر یہ ملک بنا اس کے سرچشمے اور اس کے source کے مطابق اگر ہم اپنا تصورِ تاریخ قائم نہیں کریں گے تو عقل میں کچھ آئے گا' اور عمل میں کچھ اور ہی آئے گا۔ جب یہ ہوا کہ تصورِ تاریخ آپ نے کہیں سے لیا اور نتائج تاریخ کسی اور ذریعے سے برآمد کیے تو ان کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا اس اختلاف کا لازمی نتیجہ انتشار تھا (۲۹) اور اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصب العین سے وابستگی کمزور پڑ گئی۔ آج اگر پاکستان کا کوئی باطنی بحران ہے تو وہ یہ ہے کہ نصب العین ذہنوں میں نہیں ہے۔ ملک کو محض بچا لینا نصب العین نہیں شرط ہے' جس طرح سانس لینا زندگی نہیں شرطِ زندگی ہے۔ مغربی جمہوریت کو مارشل لاء یا Theocracy کا بہتر متبادل ہونے کی حیثیت میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن فلسفۂ تاریخ کا یہ سبق ہے کہ اس کے ذریعے مملکتِ خداداد پاکستان کو ایک جدید اسلامی فلاحی ریاست ہرگز نہیں بنایا جا سکتا۔ سیاسیات اور بین الاقوامی تعلقات کے دو پروفیسر اور ''Journal of Democracy'' کے مصنفین لکھتے ہیں:

The new and fragile democracies that have sprung up since 1974 must live in "compressed time". They will not resemble the

European democracies of the nineteenth century, and they cannot expect to acquire the multiple channels of representation in gradual historical progression as did most of their predecessors. A bewildering array of parties, interests and movements will all simultaneously seek political influence in them, creating challenges to the polity that did not exist in earlier processes of democratization. (۳۰)

اور برطانوی محقّق Anthony Arblaster اپنی کتاب ''جمہوریت'' میں لکھتا ہے:

The secular Western democracy has its own distinct ethos, and its indiscriminate export to other parts of the world cannot lead to the establishment of a stable, truly democratic and just political order. A number of lessons can be learned from the democratic experiments made in different parts of the world, but the people in the non-Western world, particularly the Muslim Ummah, must not blindly follow any of the Western models; instead, they should draw upon their own ideological and historical sources and establish institutions that represent their own values and ideals. (۳۱)

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اورخاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
خاکِ مشرق پر چمک جائے مثالِ آفتاب　　تابدخشاں پھروہی لعلِ گراں پیدا کرے (۳۲)

تیسری جماعت میں ایک کہانی پڑھی تھی جس کا عنوان غالباً ''The Lost Ring'' تھا۔ایک شخص رات کے وقت راہداری کے ساتھ روشنی تلے کچھ تلاش کر رہا تھا۔کسی نے پوچھا بھائی کیا تلاش کرتے ہو؟ کہنے لگا کہ اس کی انگوٹھی کھوگئی ہے ۔ پوچھنے پر بتایا کہ وہ انگوٹھی ایک جھاڑی کے قریب گری تھی ۔ پوچھنے والے نے کہا کہ اگر انگوٹھی کہیں اور کھوئی ہے تو وہ اُسے یہاں کیوں تلاش کر رہا ہے؟ تو جواب دیا کہ جہاں انگوٹھی کھوئی ہے وہاں روشنی نہیں ہے' اس لیے سہولت کی خاطر یہیں تلاش کر رہا ہوں۔

ہر وہ شخص جو'' آفاق میں گم'' ہو جانے کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو اور ذاتی مسائل و معاملات سے قدرے بلند تر سطح پر تاریخ انسانی کے بہاؤ کے رخ کا مشاہدہ کرسکتا ہو بادنیٰ تامل دیکھ سکتا ہے کہ واقعتاً تاریخ کا رُخ اسلام کے عالمی غلبے ہی کی جانب ہے اور قافلۂ انسانی اسی سمت میں رواں دواں ہے!(۳۳) اس لیے کہ ایک طرف طبیعیاتی علوم (Physical Sciences) ہیں جو درجہ بدرجہ کثرت سے وحدت' گویا شرک سے توحید کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں' دوسری طرف عمرانیات (Social Sciences) ہیں جن کی تحقیق و جستجو چاروناچار اُسی رخ پر آگے بڑھ رہی ہے کہ ابلیس کو اندیشہ لاحق ہو گیا ہے:ؔ

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف　　ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبرؐ کہیں ! (۳۴)

ڈاکٹر محمد آصف ہَن ژِنگ ٹَن اور اقبال کے تصورِ تہذیب کا تحقیقی موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی' ''تہذیبی مشن'' اور'' ملوکانہ نفسیات'' کو مدنظر رکھا جائے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مغربی تہذیب' مغربی لبرل جمہوریت ہی دنیا کی نجات کا واحد راستہ ہے؟ اقبال کے نزدیک تو یہ ''سرمایہ داروں کی جنگ زرگری'' ہے۔ لبرل جمہوریت ''نیلم پری'' کے روپ میں ''دیو استبداد'' ہے' جس کا ''چہرہ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر'' ہے۔ اخلاقی اقدار کے فقدان کی وجہ سے مغربی سائنس کی ترقی اور لبرل جمہوریت اجتماعی فلاح و بہبود کی بجائے ''ملوکانہ اغراض''، ''حکمتِ فرعونی'' اور ''حکمتِ اربابِ کیں'' کا نمونہ بن کر رہ گئی ہے''۔ (۳۵)

اور اقبال کے یہ الفاظ پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے گویا آج کے عالمی ماحول پر تبصرہ کر رہے ہیں:

''تمام دنیا کے اربابِ فکر دم بخود سوچ رہے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کے جان و مال کے دشمن بن کر کرۂ ارض پر زندگی کا قیام ناممکن بنا دیں۔ دراصل انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے اور جب تک تمام دنیا کی عالمی قوتیں اپنی توجہ کو احترامِ انسانیت کے درس پر مرکوز نہ کر دیں یہ دنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہے گی۔ وحدت صرف ایک معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو رنگ و نسل و زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت' اس ناپاک قوم پرستی' اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو مٹایا نہ جائے گا' جب تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے ''اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ'' (تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے) کے اصول کا قائل نہ ہو جائے گا' جب تک جغرافیائی وطن پرستی اور رنگ و نسل کے اعتبارات کو مٹایا نہ جائے گا' اس وقت تک انسان اس دنیا میں فلاح و سعادت کی زندگی بسر نہ کر سکیں گے اور اخوت' حریت' اور مساوات کے شاندار الفاظ شرمندۂ تعبیر نہ ہوں گے۔'' (۳۶)

اس عالمی مسئلے کا حل اقبال کے خطبہ الٰہ آباد کے ان الفاظ سے سمجھا جاسکتا ہے:

''آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو انسان کے تصور کو جغرافیائی حدود سے آزاد کرا سکتی ہے۔ جس کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست کی زندگی میں بے انتہا اہمیت حاصل ہے اور جس کا ایمان ہے کہ اسلام بذاتِ خود تقدیر مبرم ہے اور اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ معاملات کو خود اپنے ہی نقطہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ نہ سمجھیں کہ جس مسئلے کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ محض ایک نظری مسئلہ ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جس سے اسلام کے دستورِ حیات اور نظامِ عمل کے تار و پود متاثر ہو سکتے ہیں۔'' (۳۷)

اور

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں' اسلام ہے! (۳۸)

بعض 'مفکرین' کی جانب سے غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ گویا اقبال ''لبرل جمہوریت'' یعنی سیکولر سرمایہ دارانہ جمہوریت کو واحد راہِ نجات سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک ایسا کہنا غلط ہے۔ اقبال جس جمہوریت کے قائل تھے ان کے اپنے الفاظ میں' جو انہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کو لکھے' سمجھنا چاہیے:

''خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور اور جدید نظریات کی روشنی میں اس کے آئندہ ارتقاء میں حل موجود ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر یہ ضابطہ قانون صحیح طور پر سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو ہر ایک کے لیے کم از کم زندہ رہنے کا حق محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن قانونِ شریعت کا نفاذ اور ارتقاء اس سرزمین (متحدہ ہندوستان) میں ناممکن ہے' جب تک کہ آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں وجود میں نہ لائی جائیں۔ اسلام کے لیے ''سوشل ڈیماکریسی'' کو کسی مناسب شکل میں جو اسلامی قانون کے اصولوں کے مطابق ہو' قبول کر لینا ''انقلاب'' نہیں بلکہ اسلام کی اصل پاکیزگی کی طرف واپس جانا ہے۔''(۳۹)

قرآن حکیم کا پیغام ہے کہ اسلام کا عالمی غلبہ تقدیر مبرم ہے۔ اب اس انقلاب کی ابتدا کہاں سے ہوگی؟ دنیا کو تو کسی نئے نظام کی ضروت ہے اور وہ نظام اسلام کے پاس ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کیا ہم اقبال کے خواب کی قرآنی تعبیر سمجھتے ہوئے پاکستان کو اسلام کے عالمی غلبے کے لیے نقطہ آغاز بنانے کے لیے قربانیاں دینے کو تیار ہیں؟ جب یہ دعویٰ ہے کہ ''لبرل جمہوریت'' کے راستے سے علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر ملنا ممکن نہیں ہے تو اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دراصل اُس نظامِ عدلِ اجتماعی (System of Social Justice) کے لوازمات کیا ہونے چاہئیں جس کا خواب اقبال نے دیکھا تھا۔ اس حوالے سے چند نکات پیش خدمت ہیں:

(۱) ایک ایسا طاقت ور انسانی جذبہ جو جملہ حیوانی جبلتوں پر غالب آ جائے اور قوم کے افراد میں کسی مقصد کے لیے تن من دھن لگا دینے حتیٰ کہ جان تک قربان کر دینے کا مضبوط ارادہ اور قوی داعیہ پیدا کر دے۔ (۴۰)

(۲) ایک ایسا ہمہ گیر نظریہ جو افرادِ قوم کو ایک ایسے مضبوط ذہنی و فکری رشتے میں منسلک کر کے بنیان مرصوص بنا دے جو رنگ' نسل' زبان اور زمین کے تمام رشتوں پر حاوی ہو جائے اور اس طرح قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کا ضامن بن جائے! (۴۱)

جیسا کہ ایک فرانسیسی فلسفی Ernst Renan قوم کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے:

Man is a slave neither of his race nor his language, nor of his religion, nor of the course of rivers nor of the direction taken by mountain chains. A large aggregate of men, healthy in mind and warm of heart, creates the kind of moral conscience which we call a nation. So long as this moral consciousness gives proof of its strength by the sacrifices which demand the abdication of the individual to the advantage of the community, it is legitimate and has the right to exist.(۴۲)

(religion کا لفظ یہاں انیسویں صدی کی یورپی عیسائیت کے context میں استعمال ہوا ہے' جبکہ اسلام محض relion نہیں بلکہ دین ہے۔)

(۳) عام انسانی سطح پر اخلاق کی تعمیر نو جو صداقت' امانت' دیانت اور ایفاء عہد کی اساسات کو از سرِ نو مضبوط کر دے اور قومی و ملی زندگی کو رشوت' خیانت' جھوٹ' فریب' ناانصافی' جانبداری' ناجائز اقربا پروری اور

وعدہ خلافی ایسی تباہ کن برائیوں سے پاک کردے۔ (۴۳)

لبرل جمہوریت کے ذریعے یہ ممکن نہیں ہے' جیسا کہ سابق امریکی صدر جمی کارٹر کا نیشنل سکیورٹی کا مشیر برزنسکی کہتا ہے:

Without the development of a moral consciousness and adoption of an ethos of self-restraint instead of self-indulgence, the Western society would be left with no operational criteria for defining what is right and what is wrong, and thereby will slide into self-destruction. (۴۴)

(۴) ایک ایسا عدلِ اجتماعی (System of Social Justice) جو مرد اور عورت' فرد اور ریاست' اور سرمایہ اور محنت کے مابین عدل و اعتدال اور قسط و انصاف اور فی الجملہ حقوق و فرائض کا صحیح و حسین توازن پیدا کردے! (۴۵)

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام (اقبال)

(۵) ایک ایسی مخلص قیادت جس کے اپنے قول و فعل میں تضاد نظر نہ آئے اور جس کے خلوص و اخلاص پر عوام اعتماد کرسکیں۔ (۴۶)

جیسا کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین لکھتے ہیں:

''عام طور پر ایک نصب العین کے حسن کا ذاتی احساس کسی ایسے قائد یا راہنما کے ساتھ گہرا نفسیاتی یا روحانی تعلق پیدا کرنے سے حاصل ہوتا ہے جو اس نصب العین کی محبت سے پوری طرح سرشار ہو''۔ (۴۷)

ضرورت اس بات کی ہے کہ لکیر پہ لکیر پیٹنے کی بجائے تاریخی نقطۂ نظر سے اس بات پر غور کیا جائے کہ تعبیر میں کیا کوتاہی ہوئی ہے؟ ایک مکمل course of life کو تبدیل کرنے کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کرنا ہوگا؟ مروّجہ جمہوریت کا SWOT analysis کرنا ہوگا (محترم پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اپنے مضمون Islam and Democracy: Some Conceptual and Contemporary Dimensions میں اس کا حق ادا کیا ہے)۔ نظام کو بنیاد سے تبدیل کرنے اور اجتماعی زندگی کو ایک نئی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لیے تاریخ سے ہمیں کون سا مؤثر طریقۂ کار ملتا ہے؟ اور ان تمام سوالوں کے جواب تلاش کرتے وقت objectivity یعنی fairness, disinterestedness, factuality, and nonpartisanship کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

حوالہ جات:

(۱) پروفیسر محمد منور مرزا' Iqbal on Qur'anic Concept of History

(۲) ڈاکٹر محمد رفیع الدین' خودی اور فلسفہ تاریخ (حکمت اقبال)

(۳) *Dr. Absar Ahmed, History and Historical Consciousness Published in "Qur'anic Horizons"*

(۴) ایوان اقبال لاہور میں اقبال اکیڈیمی پاکستان کی جانب سے منعقدہ ۲۰۰۸ء سیمینار Science and Muslim Civilization کولمبیا یونیورسٹی کے پروفیسر Dr. George Saliba

(۵) Tibor Mende, A Glance at Tomorrow's History, Narrated by Dr. Ali Shariati in his Lecture by the same titile.

(۶) (Jack A. Goldstone, Revolutions; Theoratical, Comparitive, and Historical Studies, p 2)

(۷) سراج منیر، سابق ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ، تاریخ کی قرآنی تعبیر، ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف ''استحکام پاکستان'' پر تبصرہ، شائع شدہ ماہنامہ میثاق، مارچ ۱۹۸۶ء

(۸) ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم، صحیح فلسفۂ تاریخ کیا ہے؟ قرآن کی رہنمائی، شائع کردہ اقبال اکیڈیمی پاکستان

(۹) ڈاکٹر محمد رفیع الدین، خودی اور فلسفۂ تاریخ، حکمت اقبال۔

(۱۰) R. Panikkar, Philosophy and Revolution: The text, the context, and the texture, p 316

(۱۱) ڈاکٹر محمد رفیع الدین، خودی اور فلسفۂ تاریخ، حکمت اقبال۔

(۱۲) Iqbal, The Reconstruction of Religious Thought in Islam, The Spirit of Muslim Culture

(۱۳) Stray Reflections, The Private Notebook of Muhammad Iqbal,p 25

(۱۴) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاسنامہ کا جواب، انقلاب اخبار، ۱۰ دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲ اور گفتارِ اقبال، ص ۱۰۴، ۱۰۵

(۱۵) (Dr. Absar Ahmed, Lessons from History; Reflections on the Past, Present and Future of Two Muslim Communities, Foreword)

(۱۶) Imran N. Hosein, The Continuity of Iqbal's Qur'anic Thought; The Genesis of Pakistan and the Islamic Revolution in Iran Viewed in the context of Iqbal's Qur'anic Thought and its Continuity in Dr. Israr Ahmad, An address delivered on April 21, 1997, during the Annual Qur'anic Muahadrat (Lectures) held at Qur'an Auditorium (Lahore)

(۱۷) Dr. Absar Ahmed, History and Historical Consciousness, Qur'anic Horizons

(۱۸) (Cf., Education inan Ideological State, (اے ۔ کے ۔ بروہی) published in Aims and Objectives of Islamic Education ed. S.M. Al-Naquib Attas)

(۱۹) Judy Beishon, The Role of a Revolutionary Party

(۲۰) اقبال، زمانہ حاضر کا انسان، ضربِ کلیم، ص ۷۲۔ (۲۱) اقبال، اسرارِ خودی، ص ۳۲۲۔

(۲۲) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سٹوڈنٹس یونین کے سپاسنامہ کا جواب، انقلاب اخبار، ۱۰ دسمبر ۱۹۲۹ء، ص ۲ اور گفتارِ اقبال، ص ۱۰۴، ۱۰۵

(۲۳) علامہ اقبال، اسرار خودی

(۲۴) Karl Marx – Stanford Encyclopaedia of Philosophy".. First published Tue 26 August 2003; substantive revision Mon 14 June 2010. Retrieved 4 March 2011.

(۲۵) The famous presidential address delivered by Iqbal in the annual session of All-India Muslim League in Allahabad in 1930

(۲۶) سراج منیر، سابق ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ، مضمون: تاریخ کی قرآنی تعبیر ''استحکام پاکستان'' پر تبصرہ، شائع

شدہ ماہنامہ میثاق' مارچ ۱۹۸۶ء

(۲۷) Dr. Ahmed Afzaal, The Origin of Islam as a Social Movement; The Inevitability of Story Construction, Islamic Research Institute, International Islamic University, Islamabad, 2003

(۲۸) سراج منیر' سابق ڈائریکٹر ادارہ ثقافت اسلامیہ' مضمون: تاریخ کی قرآنی تعبیر ''استحکام پاکستان'' پر تبصرہ' شائع شدہ ماہنامہ میثاق' مارچ ۱۹۸۶ء۔

(۲۹) ایضاً

(۳۰) Schmitter, Philloppe C., Karl(Professor of Political Science and Director of the Center for European Studies at University of Stanford, Terry Lynn(Associate Professor of Political Science and Director of the Center for Latin American Studies at Stanford University, What Democracy Is...And What is Not, Journal of Democracy, Volume 2, Number 3, Summer 1991, pp. 75-88 (Article),

(۳۱) Arblaster, Anthony, Democracy(Concepts Social Thought), Open University,p96

(۳۲) علامہ اقبال' جواب خضر' بانگ درا (۳۳) ڈاکٹر اسرار احمد' استحکام پاکستان' ص ۱۴۸۔

(۳۴) اقبال' ابلیس کی مجلس شوریٰ

(۳۵) The famous presidential address delivered by Iqbal in the annual session of All-India Muslim League in Allahabad in 1930

(۳۶) ڈاکٹر محمد آصف' ہَن بِنگ ٹَن اور اقبال کا تصورِ تہذیب' اقبالیات اردو نمبر ۵۳ (جنوری تا جولائی ۲۰۱۲)' شائع کردہ اقبال اکیڈیمی پاکستان

(۳۷) اقبال' حرفِ اقبال' مرتبہ لطیف احمد شروانی' ایم ثناء اللہ خان' انشاء پریس لاہور' ۱۹۵۵ء' ص ۲۲۵ تا ۲۲۶

(۳۸) اقبال' ابلیس کی مجلس شوریٰ

(۳۹) Two letters from Iqbal to Jinnah (1937), G. Allana, Pakistan Movement Historical Documents (Karachi: Department of International Relations, University of Karachi, nd [1969]), pp. 129-133.

(۴۰) ڈاکٹر اسرار احمد' استحکام پاکستان' ص ۱۷۷۔ (۴۱) ایضاً

(۴۲) Ernst Renan(1823-92), What is a Nation?

(۴۳) ڈاکٹر اسرار احمد' استحکام پاکستان' ص ۱۷۷۔

(۴۴) Dr. Ahmed Afzaal mentioned this sentence in his essay; The Challenge of Secularism

(۴۵) ڈاکٹر اسرار احمد' استحکام پاکستان' ص ۱۷۷۔ (۴۶) ایضاً

(۴۷) ڈاکٹر محمد رفیع الدین' منشور اسلام' ص ۴۱۔